قاضی عطاءاللہ خان کی زندانی تاریخی کتاب "دپختنو تاریخ" (پشتونوں کی تاریخ) کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

نورالبصر امن*

Abstract:

Pashto language is about five thousand years old but unfortunately very less reading and writing has been done in it, due to which the language did not developed as with its age. Written scripts and materials have been founded in Pashto language approximately in 139 H. A. The era of khushal Khan is a revolutionary era for both writings and readings in Pashto language. Khushal baba has written in each and every element of Pashto language. His famous book is "DASTAR NAMA" which he has written in Mughals prison. After khushal Khan in the 20th century during British era so many Pashtuns were kept behind the bars. Among those Pashtun's, the people who were men of pen have written books on Pashtuns history beside other writings in Pashto language. This research paper will analyze those books of Pashtuns history which has been written in prisons.

تلخیص

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پشتو ادب کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے لیکن بد قسمتی سے اس میں باقاعدگی سے لکھائی پڑھائی بہت بعد میں شروع ہوا یہی وجہ ہے کہ اس میں ترقی کی رفتار بہت سست رہا۔ پشتو میں لکھی ہوئی پہلی نظم کی تخلیق ۱۳۹ ہجری میں ہوئی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے خوشحال خان خٹک کا دورہ ہر لحاظ سے پشتو لے لئے زرین ثابت ہوئی، خوشحال بابا نے پشتو میں ہر موضوع اور ہر صنف میں طبع آزمائی کی

---

* پی ایچ ڈی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ پشتو جامعہ ملاکنڈ

ہیں۔ان کی مشہور کتاب "دستارنامہ" ہے اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ مغل کی زندان میں تخلیق ہوئی ہے اور دوسرا یہ کہ یہ پہلی کتاب ہے کہ اس میں پشتونوں کی تاریخ کا ذکر موجود ہے۔خوشحال خان خان خٹک کے بعد بیسوی صدی میں برطانوی دورِ حکومت میں بہت سے پشتونوں کو جیل میں ڈالا گیا ہیں،ان میں بہت سے اہلِ قلم بھی تھیں۔ان میں ایک نامور شخصیت قاضی عطاءاللہ بھی تھا انہوں نے "دپختنوتاریخ" (پشتونو کی تاریخ) کے نام سے ایک کتاب ہندوستان کی مختلف جیلوں میں لکھا ہے۔اس مقالے میں اسی کتاب کا تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: "پشتون، تاریخ، زندان، قاضی عطاءاللہ خان

اسکو پشتونوں کی بدقسمتی کہیے یا حالات کی ستم ظریفی، کہ ابتداء ہی سے ان میں لکھنے پڑھنے کا شوق، دستور اور مواقع بہت ہی کم رہا ہے یہی وجہ ہے کہ پشتونوں کی تاریخ کی کھڑیاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس جدید دور میں بھی قیاسات اور خیالی ماخذوں پر پیوند رہا ہے۔اسمیں اگر ایک طرف جغرافیائی عوامل کا عمل دخل رہا ہے تو دوسری طرف ان کی طبعی میلان بھی اس طرف بہت کم رہا۔پشتون تاریخی المیوں کی وجہ سے اکثر ناخواندگی کے اندھیروں میں رہا ہے یا ان کو رکھا گیا ہے۔اسی لیے لکھنے پڑھنے اور تعلیم و تعلم کا کام بھی ان میں بہت کم ہو رہا ہے۔[1]

> "پشتونوں نے جس ماحول میں زندگی گزاری ہے بے شک اسمیں انہیں اپنی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کے بہت کم مواقع میسر آئے دنیا کی دیگر ترقی یافتہ اقوام چاہے کیسے ہی ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کی حامل کیوں نہ ہو، پشتون ان کی وجہ سے اپنی اصل نسل اور تاریخی مقام کو نہیں کھو سکتا۔تہذیب و تمدن اور ترقی کے یہ ادوار اسی طرح آتے اور جاتے رہیں گے"[2]

اس طرح کئی دوسری وجوہات کی بنا پر پشتونوں کے تاریخی مسائل نے جنم لیا ہے۔پشتونوں کی اصل نسل کے بارے میں محققین مختلف گروہوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔جسکے نتیجے میں پشتونوں کی اصل نسل کے بارے میں کئی نظریئے سامنے آ گئے جو کہ ابھی تک زیرِ بحث ہے۔اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتداء میں پشتونوں کی تاریخ غیر پشتونوں نے لکھی ہے۔اور انہوں نے یہ سب کچھ قیاسات اور ادھر ادھر کی کہانیوں کی بنیاد پر لکھی ہے۔

> "افضل خان خٹک کی "تاریخ مرصع" اور قاضی عطاءاللہ کی "پشتونوں کی تاریخ" کے درمیان اور پہلے اور بھی

تاریخ کی اہم کتابیں موجود تھیں۔ جسمیں تاریخ ابراہیمی، ابراہیم بیٹنی کا، خلاصتہ الانصاب حافظ رحمت خان کا، عہد بنگش مفتی ولی اللہ فرخ آبادی کا، تواریخ خورشید جہان، شیر محمد گنڈاپور کا، تاریخ سلطانی، سلطان محمد خان بار کزے کا، حیات افغانی ڈپٹی حیات خان یوسفزے کا اور اسی طرح اور بھی لیکن یہ ساری کتابیں پشتو زبان میں نہیں تھیں۔ ایک اور اہم کتاب احمد علی کہزاد نے افغانستان کی پرانی تاریخ لکھی ہے۔ یہ بھی اصل میں فارسی کی ہے لیکن اسکا پشتو ترجمہ ہوا ہے''[3]

اہلِ زبان اور اہلِ وطن نہ ہونے کی وجہ سے ہر ایک مورخ نے اپنی طرف سے جو دل میں آیا ہے وہی لکھا ہے اور آنے والے محققین کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ اور ابھی تک یہ مسئلہ لا ینحل ہے کہ پشتونوں کا اصل منبع کون سا ہے یا کہاں سے ہے۔ پشتو زبان میں سب سے پہلے پشتون مورخ افضل خان خٹک نواسہ خوشحال خٹک نے تاریخ کی کتاب ''تاریخِ مرصع'' کے نام سے لکھی ہے۔

''تاریخِ مرصع'' جیسا کہ اپنی شہرت کی بدولت نہ صرف پشتون مورخوں اور طالب علموں کو بلکہ عام پڑھنے والوں کو بھی معلوم ہے کہ خوشحال خان خٹک پشتونوں کے بڑے سردار، شاعر، ادیب اور مفکر جو خان علین مکان کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے کے بڑے بیٹے اشرف خان ہجری کے بڑے بیٹے افضل خان خٹک کی تالیف ہے اور بہت سے پشتون مورخوں نے حوالے کے طور پر استعمال میں لایا ہے''[4]

اس مقالے میں، خصوصی طور پر جدید دور کے نامور مورخ، ماہرِ تعلیم اور پشتونوں کے قومی راہنما خدائی خدمتگار قاضی عطاء اللہ خان کی تاریخی اور زندانی زندگی اور انکی زندانی تاریخی کتاب ''دپختنو تاریخ'' (پشتونوں کی تاریخ) کا تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

پشتو ادب کی تاریخ میں شعوری طور پر جو زیادہ کام ہوا ہے تو وہ بیسوی صدی کے تیسرے عشرے کے بعد ہوا ہے اور اس دوسرے میں دوسرے ادب کے ساتھ ''زندانی ادب'' بھی مقدار اور معیار کے لحاظ سے کافی زیادہ تخلیق ہوا ہے۔ اس دور میں اگر ہم صرف ان کتابوں کو لیں جسکے بارے میں پشتونوں کی تاریخ کا سرسری ذکر ہوا ہے اور ان کتابوں کا کچھ حصہ یا مکمل جیل میں تخلیق ہوئی ہے تو ان میں باچاخان خان عبدالغفار خان کی کتاب ''زماژوند اور جدوجہد'' (میری زندگی اور جدوجہد)'' خان عبدالولی خان کی ''رختیا رختیا دی'' (سچ سچ ہے) اور ''باچاخان او خدائی خدمتگاری'' خان عبدالصمد خان کی ''زماژوند او ژوندون'' (میری زندگی اور زندگانی) فضل الرحیم ساقی کی د ''صبر جنگ'' (صبر کی جنگ) اور ''خدائی خدمتگار تحریک کی مختصر تاریخ''

شامل ہیں۔ لیکن ان میں سب سے اہم کتاب جو نہ صرف مکمل پشتونوں کی تاریخ پر لکھی ہوئی ہے بلکہ پورا کتاب جیل کے اندر قید و بند کے دوران میں لکھی ہوئی ہے وہ قاضی عطاءاللہ خان کی کتاب "پشتونوں کی تاریخ" ہے۔ اسی دور میں پشتون رہنماؤں کو بہ یک وقت پر کئی مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ ایک طرف تاجِ برطانیہ سے آزادی کا سوال تھا جسکے مقابلے میں یہ لوگ ہر لحاظ سے کمزور تھے لیکن پھر بھی تاج برطانیہ کے ہر ظلم کے سامنے سیسہ پھیلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے تھے۔اور ان کے قدموں میں زرا بھر لغزش نہیں آئی اور نہ ان کے حوصلوں اور ارادوں میں دراڑیں پڑ گئے۔ دوسری طرف پشتون معاشرے کو تعلیمی، صنعتی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور سیاسی پسماندگی کے خلاف عوام میں شعور اجاگر کرنے کا چیلنج بھی تھا۔ یہ سارے کام بہ یک وقت کرنا اگر ناممکن نہ تھا تو مشکل ضرور تھا۔ لیکن خدائی خدمتگار ایسا باحوصلہ، باکردار، باعزم، باکردار، بامہذب، باشعور، باپروہ اور باادب تھے کہ دنیا میں اسکی مثال مشکل سے ملتی ہے اسی لئے تو وہ اپنے مقصد کے حصول میں بامراد ہو گئے۔

انگریزوں نے پشتونوں کے سروں پر پاؤں رکھ کر پشتونخوا میں داخل ہو گئیں لیکن پھر بھی انکو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سرزمین پر ایسا جگہ بہت کم ملے گا جہاں اس وطن کی حفاظت کے لئے خون نہیں بہہ گئی ہو۔ جنگ آزادی کے اس مجاھدوں، شہیدوں، مبارزوں اور غازیوں کا ذکر اتنا طویل ہے کہ اس کے لئے کئی دفتر درکار ہیں،اس کی نشانیاں اور گونج ابھی تک پشتونخوا کی وادیوں میں محسوس ہو رہا ہے [5]

اب صاحبِ کتاب قاضی عطاءاللہ خان کی زندگی کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ کون تھا؟ پشتونوں کی سیاسی اور ادبی تحریکوں میں خدائی خدمتگار تحریک کو بہت اہم مقام حاصل ہے کیونکہ اس تحریک نے شعوری اور لاشعوری طور پر پشتو زبان و ادب کے لیے اتنا گراں قدر خدمات ادا کئے ہیں کہ اس کے ذکر سے پشتو ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔ اس تحریک نے ایسے شاعر و ادیب، صحافی اور مورخ پیدا کئے ہیں کہ انہوں نے وطن اور زبان کی خدمت اور ترویج و اشاعت کو جزو ایمان سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ تاج برطانیہ جیسی عظیم سلطنت کو للکارا اور ان کے سامنے دیوارِ چین کی طرح کھڑے رہے، اس تحریک سے وابستہ لوگوں نے اپنی جان، مال، جائیداد، اولاد اور آرام سب کچھ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مقابلہ کیا جسکے نتیجے میں دوسرے بے انتہا ظلموں کے ساتھ ساتھ قید و بند اور نظربندی بھی لازم سہنی تھی۔ جن خدائی خدمتگاروں نے انگریزوں کی قید میں اپنی

زندگی تباہ کی لیکن اسکے بدلے قوم کو سیاسی نفع کے ساتھ ساتھ قلمی منافع بھی فراہم کی ان میں ایک قاضی عطاء اللہ خان بھی ہیں۔

قاضی عطاءاللہ خان ۱۸۹۶ء کو قاضی نصراللہ خان کے گھر میں پشاور کے ایک گاؤں ارباب لنڈے میں پیدا ہوئے[6] قاضی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی چونکہ قاضی صاحب کی والد ایک عالم فاضل آدمی تھے اس لئیے انہوں نے قاضی عطاءاللہ کو پشاور کے مشن سکول میں داخل کیا اور اسکے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا قاضی عطاءاللہ خان نے ۱۹۱۸ء میں وکالت کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد وطن واپس آگئے۔ ۱۹۲۵ء میں قاضی صاحب کا گھرانہ پشاور سے مردان منتقل ہوا اور وہاں پر مستقل رہائش اختیار کی[7]۔ اگرچہ قاضی صاحب نے مردان میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا لیکن قاضی صاحب کا بیدار ضمیر بے چین تھا وہ اپنے قوم کیلئے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اسلئے انہوں نے وکالت چھوڑ کر خان عبدالغفار خان (باچاخان) کے ساتھ شامل ہوگئے، اور "انجمن اصلاح الافاغنہ" کے نام سے ایک فلاحی تنظیم کی بنیاد رکھ دی، اس تنظیم کا اصل مقصد پشتونوں کی معاشرتی اصلاح اور تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ اسی ارادے کو عملی کرنے کی غرض سے ازاد اسلامیہ مدرسوں کے نام سے تعلیمی جہاد کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

> "اس انجمن کے ممبران میں خان عبدالغفار خان باچاخان اتمانزے، حاجی عبدالغفار خان اتمانزے، خان آباد خان اتمانزے، حاجی شہنواز خان اتمانزے، عبدالاکبر خان عمرزے، میاں جعفر شاہ کاکاخیل، غلام محی الدین خان تنگی، خادم محمد اکبر چارسدہ، میاں عبداللہ شاہ قاضی خیل، میاں احمد شاہ قاضی خیل، فضل اکرم نرے، قاضی عطاءاللہ خان مردان، تاج محمد خان چارسدہ، اور اتمانزے میں آزاد اسلامیہ مدرسہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس مدرسے میں قرآن شریف، احادیث، فقہ اور تاریخ اسلام، عربی، اردو، انگریزی، حساب اور اسکے ساتھ سلائی، کارپنٹری، کمہاری اور کھڈی کا کام بھی سکھایا جاتا تھا"۔[8]

ایک اندازے کے مطابق اس مدرسوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ تک پہنچ گئے تھے اور یہ سارے ادارے چندے کے پیسوں پر چلتا تھا۔ قاضی صاحب اس مدرسوں کے چلانے میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔

> "قاضی عطاءاللہ خان ایک روشن خیال، ایثار پیشہ قومی رہنما اور صاحب طرز پشتو ادیب تھے ۱۹۱۹ء میں پہلی دفعہ باچاخان (خان عبدالغفار خان) کی قیادت میں رولٹ ایکٹ کی مخالفت کی تحریک میں حصہ لیا، ساری عمر ان کے ساتھ گزاری، انجمن اصلاح افاغنہ، خدائی خدمتگار، یوتھ لیگ اور کانگرس میں بھرپور حصہ لیا، قید و بند کی صعوبتیں جھلیں، وہ باچاخان کے بہترین مشیر اور تحریک کا "شہ دماغ" تھے۔ باچاخان بھی ان کے قیمتی

مشوروں کو بخوبی قبول کرتے تھے۔"[9]

قاضی عطاءاللہ خان کے رگوں میں ایک آزاد فطرت پشتون کا خون گردش کررہا تھا۔اس لیئے وہ باچا خان کے ساتھ وطن کی آزادی کیلیئے دن رات جدوجہد میں مصروف تھا۔اوراس گناہ میں وہ کئی بار قید وبند میں بھی ڈالا گیا لیکن ان کے مصمم ارادوں میں کوئی بھی لغزش نہ آئی۔اور وہ آخر وقت تک سامراج کے خلاف سیاسی او قلمی میدان پر برسرِ پیکار رہا۔ باچا خان ان کی گرفتاری اور جیل کے بارے میں اسطرح رقمطراز ہے کہ۔

"جب ہم آلہ آباد پہنچ گئے تو یہاں پہ ہم سے ڈاکٹر صاحب کو اتارا گیا اور اسکو آلہ آباد کی نینی جیل کو بھجوایا گیا۔ پھر سعداللہ کو اتارا گیا اور اسکو بنارس کے جیل کو بھجوایا، پھر بہار کا صوبہ شروع ہو گیا اور ادھر قاضی عطاءاللہ خان کو ہم سے اتارا گیا۔اور اسکو گیا جیل بھجوایا۔وہ بیچارہ اکیلا تھا اور مجھ سے بھی زیادہ اکیلا تھا۔ میں تو کچھ نہ کچھ سو رہا تھا اور اسکو بالکل نیند نہیں آرہی تھی۔اور نہ سو سکتا تھا۔ کیونکہ تنہائی کی وجہ سے ایک سال تک بالکل نہیں سویا تھا"۔[10]

قاضی صاحب ایک حساس انسان تھا اسی لئے وہ جیل میں ایک ذہنی کوفت، آزمائش اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جیل کی دنیا اگرچہ ہر ایک انسان کے لئے اذیت ناک ہوتی ہے لیکن ادیبوں اور شاعروں کیلیئے یہ چند گنا زیادہ اذیت ناک ثابت ہوتی ہے اس اذیت میں کچھ کام کرنا یا سوچنا کتنا مشکل ہوتا ہے اسکا اندازہ اس شخص کو بخوبی ہو سکتا ہے جو ذاتی طور پر اسی حالات سے گزرا ہوا ہو۔ لیکن اس سے قاضی صاحب کی ذہنی اور اعصابی مضبوطی کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا حوصلہ کتنا مضبوط تھا کہ جیل کی اذیت ناک زندگی میں بھی انہوں نے اپنے قلم کو زنگ آلود ہونے سے بچا لیا اور جیل میں زندانی تاریخی کارنامہ "پشتونوں کی تاریخ"۔ کے شکل میں کر کے پشتونوں پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔

تاریخ لکھنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے اور پشتونوں کی تاریخ تو اور بھی زیادہ مشکل ہے کیونکہ اسمیں مواد کی بہت کمی ہے اور تاریخ کیلیئے مواد سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ لیکن تاریخ لکھنا ایک بہت ہی ضروری اور لازمی کام بھی ہے۔ پشتونوں کی تاریخ چند وجوہات کی بنا پر ابتداء ہی سے نہیں لکھا گیا ہے اسیلئے اسمیں ابھی بہت غلطیاں اور ابہامات ہیں۔ لیکن قاضی صاحب نے یہ تمام مشکلات بالائے طاق رکھ کر جیل ہی میں پشتونوں کی تاریخ لکھنے کیلیئے کمر باندھ لی۔ ویسے تو انہوں نے بہت پہلے سے یہ ارادہ رکھتا تھا لیکن سیاسی

سر گرمیوں کی وجہ سے وقت ملنا مشکل تھا جیل میں چونکہ وقت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تو قاضی صاحب نے اس وقت کو کام میں لانے کا زرین موقع سمجھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ قیمتی کام کر ڈالا۔

"ویسے تو بہت عرصے سے میرا یہ شوق تھا کہ میں اپنی پشتون قوم کی تاریخی حالات اور واقعات کو جمع کروں۔ اور اسکو ایک کتاب کی شکل میں ان کو پیش کروں، صوبہ خیبر پختونخوا میں قومی تحریک کے شروع ہونے اور اسمیں میری شمولیت نے اس شوق کو اور بھی تیز کر دیا۔ کیونکہ ایک قوم کو ذلت اور تباہی سے بچانے کیلئے اسی قوم کی تاریخ ایک زبردست اسلحہ ہے۔ ایک قوم کو گرے ہوئے حالات سے اٹھانے میں تاریخ کا بڑا عمل دخل شامل ہے۔ دنیا میں ہر ایک قوم اپنے آباءواجداد کے اچھے کارناموں سے عبرت کا سبق لیتی ہے اور آگے جانے کی تیاری کرتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہے کہ دوسری اقوام کی طرح ہمارے پٹھانوں کی تاریخ بھی بہت شاندار رہے۔ خصوصاً قومی آزادی کیلئے پٹھانوں نے جتنی قربانی دی ہے۔ غیر ملکی حکومتوں کے جتنے مقابلے ہم نے کی ہے دنیا میں اسکی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ اسلیئے میری یہ تمنا ہے کہ اپنے پشتون بھائیوں کو اپنے اسلاف کی تاریخ پیش کروں۔ اور اس صورت میں اپنے قوم کی ایک بڑے خدمت کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مگر یہ ایک ایسا کام تھا کہ اس کیلئے فارغ فرصت درکار تھا اور میں زیادہ مصروفیات کی وجہ سے بہت عرصے تک اس مقصد میں کامیاب نہ ہوا"۔ [11]

ارادے جن کی پختہ ہو اور یقین جن کا خدا پر ہو تو کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے قاضی صاحب چونکہ اپنے ارادے میں نیک اور پر خلوص تھا تو خدا نے ان کو ایسا موقع فراہم کیا کہ اس سے اور اچھا موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ خدائی خدمت گار تحریک کی سیاسی اور تعلیمی سر گرمیوں پر حکومتِ برطانیہ ناراض ہوئے اور خدائی خدمتگار کو دھڑا دھڑ گرفتار کر رہے تھے تو قاضی عطاء اللہ خان بھی ان سیاسی قیدیوں میں شامل تھا۔ اپنی گرفتاری کا قصہ کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

"دسمبر ۱۹۳۱ء میں انگریزی حکومت سے جب ہمارا سیاسی جدوجہد برداشت نہ ہوئی تو عام خدائی خدمتگار کو صوبے کے مختلف جیلوں میں قید کیا اور ہم چار بندے یعنی فخرِ افغان خان عبد الغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب، سعد اللہ خان، ڈاکٹر صاحب کا بڑا بیٹا اور مجھ کو اپنے صوبے سے بہت دور ہندوستان کے الگ الگ جیلوں میں بند دیوان کیا۔ چند مہینے تو ہم بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ پھر میں اور سعد اللہ خان سنٹرل جیل بنارس میں اکھٹا ہو گئے۔ اس وقت مجھ کو ایک لمبہ عرصہ مل گیا اور میں نے اپنے دیرینہ خواہش کی تکمیل کیلئے بسم اللہ پڑھی۔ اور اس کتاب کو لکھنے کا ابتداء کیا۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ایک تاریخی کتاب لکھنے کیلئے کتنی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ اور ایک قیدی کی حیثیت سے کتابوں کیلئے میں جیلروں کا محتاج تھا۔ میں یہ نہیں

کہوں گا کہ جیل کے عملے نے کتابوں کے حصول میں میری مدد نہیں کی مگر ہر ایک کتاب کو حاصل کرنا ان کیلئے بھی آسان نہیں تھی۔ بہر حال جو کتابوں کے حصول میں میری مدد نہیں کی مگر ہر ایک کتاب کو حاصل کرنا ان کیلئے بھی آسان نہیں تھی۔ بہر حال جو کتابیں وہ مہیا کر سکتا تھا انہوں نے مجھے پہنچادیا اور میں نے اپنا کام شروع کیا۔ اس موقع پر میں اپنے عزیز رفیق سعد اللہ خان کا بہت ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔ بلکہ اکثر مضامین کے لئے میں ان کو کہا کرتا تھا اور وہ لکھتا رہا۔ صرف لکھنا نہیں بلکہ کتابوں کے مطالعے میں بھی میرا ہاتھ بٹایا"۔[12]

اس کتاب کی ابتداء بنارس جیل کراچی میں ۱۹۳۲ء میں ہوا اور اسکا مسودہ کب مکمل ہوا اسکا کچھ واضح ثبوت نہیں ہے۔ لیکن اس مسودے کو اس وقت کے مشہور اور واحد اخبار "پشتون" میں قسط وار شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور چند مہینوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن قسط کو موزوں جگہ پر ختم نہ کرنے کی وجہ سے قاضی صاحب اس سلسلے سے مطمئین نہیں تھا اور یہ سلسلہ چند قسطوں کے بعد رکا گیا۔ پشتو زبان کے مانا ہوا قلم کار اور مورخ "پشتون" کے باقاعدہ قلمکار کی حیثیت سے پشتونوں کی سُتھری اور چمکتی تاریخ کو "پشتون" کے ذریعے قوم کو پیش کر رہا تھا اور اس کے ذریعے محفوظ ہو رہا تھا۔[13]

"پشتون" میں اس تاریخ کی قسط وار بندش کے بعد عوام نے اسی کی اشاعت کا پُر زور مطالبہ کر رہا تھا۔ لیکن کتاب چاپنا بھی ایک بہت مشکل کام ہے۔ اور جب قاضی صاحب اسی کتاب کے چھاپنے کی تیاری کر رہا تھا تو ایک دفعہ پھر قاضی صاحب پابندِ سلاسل ہوئے۔

"۱۹۴۲ء میں ہم پھر گرفتار ہوئے۔ اور پشاور کے سنٹرل جیل میں بندیوان ہو گئے۔ اسی وقت کو میں نے غنیمت سمجھا اور یہ ارادہ کر لیا کہ پرانا مسودہ کو منگوالو کیونکہ وہ واضح نہیں تھا اور اس پر نظر ثانی کی بھی ضرورت تھی۔ یہ مسودہ "پشتون" کے ایڈیٹر کے پاس پڑا تھا ان سے منگوا کر نئے سرے سے اسکی ترتیب شروع کی اس دفعہ ہمارے جیل کے ساتھیوں میں امیر محمد خان، کامدار خان (مرحوم) صنعت خان وغیرہ شامل تھے۔ ان صاحبوں نے ہمارے ساتھ کافی مدد کی اور میں نے مسودے کو دوبارہ صحیح اور صفا حالت میں مرتب کیا"[14]

مکمل ہونے کے بعد پھر بھی اس مسودے کو کتابی صورت میں شائع ہونے کی عزت نصیب نہ ہوئی کیونکہ جیل سے رہا ہونے کے بعد قاضی صاحب کو کانگرس کی حکومت میں وزارتِ تعلیم کا قلمدان سپرد کیا گیا اور ایک دفعہ پھر قاضی صاحب سیاسی سرگرمیوں میں ایسا الجھ گیا کہ مسودے کو دیکھنے کی فرصت بھی نہیں مل رہی تھی۔ یہ مسودہ چار جلدوں پر مشتمل تھا اور اسکی پہلی جلد ے ۱۹۴ء میں عبدالخالق خلیق[15] کی کوششوں سے

شائع ہو گئی۔ لیکن تمام جلدیں مکمل کتابی صورت میں یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور نے تیسری دفعہ اپریل ۲۰۱۳ء میں شائع کیا۔ یہ ضخیم کتاب ۱۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہیں جو کہ پشتونوں کی تاریخ کا تقریباً تین سو سال کے عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔

"پشتونوں کی تاریخ بہت طویل ہے۔ میں نے صرف پشتونوں کی تاریخ کا دوسرا دور یعنی سال ۱۶۲۲ء سے ۱۸۷۹ء تک لیا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جو محمود غزنوی سے شروع ہوتا ہے۔ شیر شاہ سوری اور بہلول لودھی تک پہنچا ہے۔ اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا ہے جسکی تاریخ میں نے لکھ لی"۔[16]

ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اس کی تاریخی اہمیت کے بارے میں لکھتا ہے کہ۔ قاضی عطاءاللہ کی "پشتونوں کی تاریخ" پٹھانوں کی تاریخ کے تاریخ میں تاریخ کی دوسری کتاب ہے۔ کہ ایک پشتون نے پشتو زبان میں لکھا ہے۔[17]

اس کتاب کا پہلا حصہ جو کہ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اسکے عنوانات کی فہرست کچھ اسطرح ہے۔۔۔ دیباچہ، پشتونوں کی تاریخ، پشتونوں کی اصل نسل اور اسکی وطن مالوف، افغانستان کی فاتح ممالک، پٹھانوں اور ان کے ملک کے حالات ۱۶۲۲ء سے، نادر شاہ، درانی حکومت کی ابتداء، عہد تیمور شاہ، زمان شاہ، شاہ محمود، وزیر فتح خان، بارکزو کی اقتدار، حبیب اللہ خان، حکومت ایران کی ہرات پر حملہ شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں جو کہ ۵۶۱ صفحات تک ہیں۔ افغانستان پر انگریزوں کا پہلا حملہ ۱۸۳۸ سے ۱۸۴۲ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے اور یہ حصہ آٹھ مختلف ابواب پر پھیلا ہوا ہے۔ تیسرا حصہ ۱۸۱۳ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۸۰ء تک واقعات پر پھیلا ہوا ہے اور یہ ۱۲۵ ابواب پر مشتمل ہیں۔ آخری حصہ اصل میں امیر عبدالرحمن[18] کی لکھی ہوئی تاریخ ہے جو کہ قاضی عطاءاللہ خان نے ترجمہ کیا ہے حالات اور واقعات کا تسلسل ایک ہی ہے اسی وجہ سے اسی کو بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

"یہ حصہ (چوتھی جلد) اس سلسلے کی کڑی نہیں ہے بلکہ یہ الگ قسم کی ہے تو اس پر ہم نے چند دن اسی پر لگائے کہ اسکو شائع کروں یا نہ؟ آخر میں علماء دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ یہ الگ نوعیت کی نہیں ہے۔ وہ حصے بھی پشتونوں کی آزادی کی تاریخ ہے اور یہ بھی اس قسم کا ایک مضمون ہے۔ اس لئے اسکو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اور یہ ہے پشتونوں کی تاریخ کا چوتھا جلد جو اسمیں شامل ہے۔ تو یہ کتاب شائع ہوا اور آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کتاب مرحوم امیر عبدالرحمن خان کے قلم سے لکھا گیا ہے۔۔ لیکن افسوس کہ قاضی صاحب کی

اصل کتاب نہیں ملی ہے"[19]

اسکی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ افغانستان کے نامور محقق عبدالحیٔ حبیبی نے اسکے بارے میں لکھا ہے کہ۔

"قاضی عطاء اللہ خان نے اپنے قید و بند کے طویل عرصے میں اپنی بلند ہمتی اور علمی لیاقت سے جو اہم کام سرانجام دیا ہے وہ پشتونوں کی تاریخ لکھنی ہے۔ جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ شاہکار (۱۵۰۰) سے جو احمد شاہ بابا کے عصر سے امیر عبدالرحمن کے بادشاہی تک ۱۳۰ سال کے واقعات اور حالات پر مشتمل ہیں۔ پشتونوں کی قومی جدوجہد کی ایک مفصل داستان ہے۔ جو کہ مستند انگریزی کتابوں کی قومی جدوجہد کی ایک مفصل داستان ہے۔ جو کہ مستند انگریزی کتابوں اور دوسرے ماخذوں کے حوالے سے بہت اچھے انداز میں لکھی ہوئی ہے"[20]

صدیق اللہ رشتین قاضی عطاء اللہ اور اسکی تاریخ کے بارے میں اپنا رائے کچھ اسطرح بیان کرتا ہے کہ۔

"قلم اٹھا کر پشتون قوم کی گزرے ہوئی تاریخ کو لکھنا شروع کیا۔ اور پشتو زبان میں چار جلدوں میں ایک ضخیم تاریخ لکھ لی۔ اب یہ کتاب ان کی علمی اور ادبی ذہن کا ایک قیمتی میراث کے طور پر پشتون قوم کیلئے ایک یادگار ہے۔ قاضی صاحب انگریزی اردو اور فارسی زبان میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ قاضی صاحب ایک ماناہوا خطیب بھی تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار جرگو اور اجلاسوں میں جوش سے بھرے ہوئے خطبے دیئے ہیں۔ اور اپنی قوم کی عزت اور غیرت کی راہ دکھائی۔ اسکے ساتھ ساتھ سیاسی اور اجتماعی واسطے سے بھی علمی اور ادبی خدمات سرانجام دیا۔ اپنی زبان کی ترقی اور پشتونوں کی تاریخ کی عظمت کا شدید آرزومند تھا"[21]

ڈاکٹر اشفاق احمد اسی کتاب کے بارے میں لکھتا ہے۔

"تاریخ کے علاوہ ان کی نثر بھی پشتو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اور ہماری پشتو ادب کی وسعت میں کافی ہاتھ رکھتی ہے۔ اگرچہ یہ تاریخ عالمانہ اور محققانہ زبان و اسلوب رکھتا ہے اور اس کا تعلق گہرے مطالعے اور مشاہدے سے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود سادہ اور رواں ہے اور ایک عام آدمی بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے"[22]

کتاب وہی ہے جس سے کوئی استفادہ کر سکیں، کوئی اس کا مطالعہ کریں اور اس کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ کتاب آسان اور عام فہم ہو تا کہ مطالعے کے دوران پڑھنے والے مشکل اور بوریت محسوس نہ

کریں اور تاریخ کا موضوع ایسا ہے کہ اسمیں بہت کم لوگ دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن قاضی عطاءاللہ خان نے اس خشک اور مشکل موضوع کو بہت ہی آسان اور عام فہم بنا دیا ہے۔ زبان اتنی عام فہم آسان اور رواں ہے کہ نہ صرف یہ کہ لغت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی بلکہ پڑھنے والے کو اپنا ساتھ ایسا لگتا ہے کہ پھر پڑھائی میں علم، مزہ اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔

نتیجہ

پشتو زبان وادب میں پشتونوں کی تاریخ پر لکھی ہوئی یہ کتاب تاریخ کی مطالعے کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ کتاب ایک مستند شخصیت نے مستند مواد کی مدد سے لکھی ہے، اور اسکی یہ ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب قید و بند کے دوران تحریر ہوئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تاریخ کی یہ پہلی کتاب ہے جو جیل کے اندر تخلیق ہوئی ہے۔

سفارشات:

اس کتاب کو تدوینِ متن کے ساتھ دوبارہ شائع کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اس کتاب کو اردو، انگلش اور دسری زبانوں میں ترجمہ کنا چاہیے تاکہ نان پشتو والوں کے لئے اسانی ہو۔

اس کتاب تاریخ کی نصاب میں شامل کرنا چاہیے۔

حوالہ جات

---

1 خٹک، ڈاکٹر راج ولی شاہ "دسر خبری" ابتدائی باتیں "دپختنو تاریخ" قاضی عطاءاللہ خان کے، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، اپریل ۲۰۱۲، ص(ج)

2 عبدالقادر، مولانا "مقدمہ" دی پٹھان" سرالف کیرو، ترجمہ سید محبوب علی، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی ۲۰۰۸ء۔ ص ۳۔

3 خٹک، راج ولی شاہ، دسر خبری" س ص(ب)

4 کامل، دوست محمد خان "مقدمہ "تاریخ مرصع، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور ۲۰۰۶ء ص ۵۔

5 امن، نورالبصر "پشتو میں زندانی ادب" پی ایچ ڈی مقالہ، شعبہ پشتو جامعہ پشاور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۲۴

6 ہمیش خلیل "د قلم خاوندان" پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء ص ۳۲۶

7 http://en.wikipedia.org/qaziatattaullahkhan-138-2012

8 احمد کاکا "خدائی خدمتگار تحریک" جلد اول، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، جنوری ۱۹۹۱ء، ص

9 شفیع، محمد صابر "شخصیات سرحد" یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، س۔ن، ص ۵۸۱

10 باچاخان "زماژوند او جدوجہد" دانش خپرندویہ ٹولنہ پشاور، ص ۵۸۰

11 عطاءاللہ خان، قاضی "دپختنوتاریخ" یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور ۲۰۱۲، ص ۳۔

12 ایضا، ص ۳

13 ڈاکٹر، اشفاق احمد "پشتو ادب کی ترقی میں پشتون مجلے کا کردار" پی ایچ ڈی مقالہ شعبہ پشتو جامعہ پشاور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۹۱

14 عطاءاللہ خان، قاضی "دپشتنوتاریخ" س ۴

15 عبدالخالق خلیق شاعر، ادیب اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ادارہ اشاعتِ سرحد پشاور کا مالک بھی تھا

16 ایضا، ص ۵

17 خٹک، راج ولی شاہ، "د سرخبرے" ص ۱

18 امیر عبدالرحمٰن ۱۸۸۰ سے ۱۹۰۱ تک افغانستان کا حکمران رہا ہے اور افغانستان کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں اس کا اہم کردار رہا ہے

19 خلیق، عبدالخالق "مقدمہ" (چوتھا حصہ) "پشتونوں کی تاریخ" ص ۹۱۷

20 حبیبی، عبدالحیئ بحوالہ آریانہ دائرۃ المعارف، علوم اکیڈمی کابل افغانستان، جلد ۵، ص ۱۵۲۵

21 رشتین، صدیق اللہ "د پشتو د نثر ھندارہ" یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور ص ۳۱۰۔

22 اشفاق احمد، ڈاکٹر "پشتو ادب کی ترقی میں پشتون رسالے کا کردار" ص ۱۳۰

فکرِ اقبال: ایک مختصر جائزہ

Iqbal's thought: A Brief Review

محمد اعظم*

Abstract

An individual's personality is flourished like a seed. Domesticated and societal environment is the Earth that after lactating its nectars. The fundamental essence of personality appears like a seed. The plant of personality uprears in the climate of education, training and in the open air of contemporary circumstances and bears fruit. We study any poet, scholar, thinker and headliner's intellectual, cerebellar aspects in the light of his climate, various phases of his education training and other external processes and motives. According to Iqbal, he did not get his vision of life from his philosophical quest. Rather, he had been devolved a specific range of vision about life. Afterwards, he used wisdom and reasoning for its evidence. But it is a fact that Iqbal thought measuring different stages, reached its climax.

1- From beginning to 1905

2- From 1905 to 1908

3- From 1908 to till death

There are three stages in which Iqbal's thought has been encircled according to the themes of his poetry.

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اصغر مال، راولپنڈی

فرد کی شخصیت ایک بیج کی مانند اگتی، پھولتی اور پھلتی ہے۔ خانگی اور معاشرتی ماحول وہ زمین ہے جس کا رس چوس کر شخصیت کا بنیادی جوہر بیج کے اکھوے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت کی آب و ہوا اور عصری حالات و تحریکات کی کھلی فضا میں شخصیت کا پودا پروان چڑھتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے۔ جس طرح بیج میں پورے درخت کا وجود جوہری صورت میں مرتکز ہوتا ہے اسی طرح ہر فرد کی خلقت میں کچھ بنیادی عناصر ہوتے ہیں جن میں سے بعض اسے اپنے اجداد سے وراثت میں ملتے ہیں۔ لہذا جب ہم کسی شاعر، ادیب، مفکر یا فن کار کے ذہنی اور فکری پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ماحول، تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل اور دیگر خارجی عوامل و محرکات سے پہلے اس کے نسلی اور خاندانی اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔(۱)

اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، وہ حکیم بھی ہے اور کلیم بھی، وہ خودی کا پیغامبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی، وہ توقیر آدم کا مبلغ بھی ہے اور تحقیر انساں سے دردمند بھی۔ اس کے کلام میں فکر و ذکر ہم آغوش ہیں اور خبر و نظر آئینہ یک دیگر ایسے ہمہ گیر دل و دماغ کے مالک اور صاحب عرفان و وجدان کے افکار اور تاثرات کا تجزیہ اور اس پر تنقید کوئی آسان کام نہیں۔(۲)

اقبال کی فکر کے زاویے اپنے اسلاف سے مختلف ضرور تھے لیکن تفکر ان کی شخصیت کا ایسا نمایاں عنصر تھا جو کہ ان کے کلام ان کی تحریروں، تقاریر اور عام گفتگو میں ہر جگہ نمایاں ہے۔(۳)

پہلا دور: (آغاز سے 1905ء تک):

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے دماغ کی پرورش تو طویل سلسلہ تعلیم میں ہوتی رہی لیکن روح کی غذا ان کو شروع ہی سے جسمانی رزق کے ساتھ باپ سے ملتی رہی۔ والدہ ماجدہ کی اچھی تربیت کا اندازہ اس مرثیے سے ہو سکتا ہے جس میں بڑھاپے کے قریب پہنچے ہوئے اقبال نے کس سوز و گداز سے ماں کو یاد کیا ہے اور اپنے جوہر کمال کو اس کا مرہون منت قرار دیا ہے۔ اقبال آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنا نظریہ حیات فلسفیانہ جستجو سے حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویہ نگاہ ورثے میں مل گیا تھا۔ بعد میں، میں نے عقل و استدلال کو اسی کے ثبوت میں صرف کیا۔ انسان کے سب سے پہلے اساتذہ اس کے ماں باپ ہی ہوتے ہیں اور ماں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے اس کے نقوش نہایت گہرے اور انمٹ ہوتے ہیں۔ والدین کے ساتھ ان کو مولانا میر حسن جیسا علمی، ادبی اور اخلاقی استاد ملا اور استاد

کی سیرت، بصیرت کے خط و خال بھی اقبال کی فطرت کے جزو بن گئے۔ شعر فہمی اور سخن سنجی میں یقیناً مولانا میر حسن سے ان کو غیر معمولی فیض حاصل ہوا۔(۴)

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کی چار سالہ زندگی کا سب سے اہم واقعہ پروفیسر آرنلڈ جیسے شفیق اور کردار ساز استاد کی شاگردی کا شرف ہے۔ جس کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو انہوں نے گورنمنٹ کالج میں صدر شعبہ فلسفہ کا جائزہ لیا۔ یوں تو بظاہر ایم۔اے فلسفہ کی جماعت میں آرنلڈ کی باقاعدہ شاگردی کی مدت صرف ایک سال ہے لیکن ایم۔اے کے بعد بھی علم و تحقیق کے میدان میں لاہور سے لندن تک پروفیسر آرنلڈ کی پر خلوص رفاقت اور رہنمائی اقبال پر سایہ فگن رہی۔ اقبال اپنے فاضل استاد کی شخصیت سے غائبانہ طور پر پہلے ہی واقف ہوں گے کیونکہ پروفیسر آرنلڈ نہ صرف علی گڑھ کالج کے استاد تھے بلکہ ایک انصاف پسند مستشرق اور مسلم دوست عالم و محقق کی حیثیت سے علی گڑھ تحریک کے معاون اور سر سید کے حلقہ خاص کے رکن بھی تھے۔(۵)

یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ جس طرح تعلیم کے ابتدائی مراحل میں انھیں شاہ جی (مولوی میر حسن) جیسا کردار ساز استاد ملا جس نے انھیں مشرقی ادبیات کے صحیح ذوق اور اسلامی علوم و حکمت کی روح سے آشنا کیا اسی طرح آخری دور میں آرنلڈ جیسا مجمع البحرین استاد بھی میسر آگیا۔ جس نے ان کے اندر تحقیق و تنقید کا مذاق پیدا کیا اور نہ صرف مغربی ادب و فلسفہ کے مطالعہ میں ان کی راہنمائی کی بلکہ ان کی شخصیت میں مشرقیت اور مغربیت کے امتزاج کی طرح ڈال دی۔(٦)

بی۔اے کی تعلیم کیلئے اقبال گورنمنٹ کالج میں جب آئے تو لاہور کی صحبتوں میں ان کی شاعری کا نخل شگوفہ، ثمر پیدا کرنے لگا۔ ان کی شاعری کا چرچا ہم جماعتوں سے نکل کر خاص احباب کے حلقوں میں ہونے لگا۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں اقبال نے یہ رباعی پڑھی:

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر　　　چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں　　　مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر(۷)

اِس دور میں بھی اُس اقبال کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جس کا آفتاب کمال بہت جلد افق سے ابھرنے والا تھا۔اس دور کی شاعری کو فکرِ اقبال کی صبح کاذب کہنا چاہیے جس کی روشنی طلوعِ آفتاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔(۸)

اس دور میں بھی ان کے ہاں حکیمانہ اشعار ملتے ہیں:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انسان　　کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے　　چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے (۹)

ان چند غزلیات میں جو بانگ درا میں درج ہیں، ارتقائے فکر و فن کی رفتار خاصی تیز معلوم ہوتی ہے۔ بعض غزلوں میں فکر کی گہرائی اور فن کی پختگی نمایاں ہے۔ان میں کچھ عشقِ مجازی کی آمیزش ہے۔کچھ روایتی متصوفانہ مضامین ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ملے جلے حکیمانہ اشعار بھی ہیں۔اندازِ بیان میں انوکھا پن ہے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ شاعر روایتی تغزل سے رفتہ رفتہ الگ ہو رہا ہے۔

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟　　اور اسیرِ حلقہ دام ہوا، کیونکر ہوا؟

جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں؟　　مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا؟ (۱۰)

اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔اقبال ہندوستان کی غلامی پر مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ نظم ہمالہ میں وطن کا شاندار ماضی اور اُس کی تہذیبی روایات کا ذکر ہے۔ صدائے درد اسی موضوع پر لکھی گئی:

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں (۱۱)

ترانہ ہندی میں ہندوستانی قومیت کا موثر اظہار ہے۔اور نیا شوالہ میں وطنیت کا خیال موجزن ہے۔

خاکِ وطن کا مجکو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں　　بچھڑوں کو ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہے مدت سے دل کی بستی　　آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں (۱۲)

اقبال کی نظم ہمالہ میں فطرت کا جو رجحان نظر آتا ہے وہ اس دور کی اور نظموں میں واضح رخ اختیار کر گیا ہے۔ مثلاً گلِ رنگین، ابرِ کہسار، آفتابِ صبح، ماہ نو، جگنو اور ایک آرزو وغیرہ۔ کائنات کا حسن اقبال کو متاثر کرتا ہے لیکن وہ اس قدر مسحور نہیں کرتا کہ اقبال پر خود فراموشی کی حالت طاری ہو جائے بلکہ یہاں پر اقبال کی فلسفیانہ طبیعت کا جو اصل جوہر نمایاں ہوتا ہے وہ قدرت کے رازہائے سربستہ کی گرہ کشائی ہے۔ ایک آرزو میں زندگی سے گریز کی خواہش نمایاں ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو (۱۳)

توحیدِ مطلق کا نظریہ:

توحید مطلق کا نظریہ، از عبدالکریم الجیلی: یہ اقبال کا انگریزی میں پہلا ریسرچ پیپر تھا۔ اس مقالے میں اقبال نے الجیلی کے انسان کامل کے نظریے پر بحث کی ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کے فکری اور ذہنی ارتقا میں اس مقالے کی خاص اہمیت ہے۔

علم الاقتصاد:

یہ ۱۹۰۴ میں شائع ہوئی۔ یہ اقبال کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا ایک باب "آبادی" ماہنامہ "مخزن" شمارہ اپریل ۱۹۰۴ میں شائع ہوا۔ شیخ عبدالقادر نے اداریے میں یہ تبصرہ کیا:

"شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے حال ہی میں ایک کتاب پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایماپر علم الاقتصاد کے نام سے لکھی ہے جس کا انگریزی نام "پولیٹیکل اکانومی" ہے اور جسے "علم سیاست مدن" کہتے ہیں۔ بلا مبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔" (۱۴)

دوسرا دور (1805ء تا 1908ء):

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان تشریف لے گئے۔ تین سال تک وہاں قیام کیا۔ قیام یورپ کے دوران اقبال کو حکمتِ فرنگ سے گہرا تعلق پیدا کرنے اور اس کی تہذیب و تمدن کو براہِ راست مشاہدہ کرنے سے طرح طرح کے فوائد پہنچے۔ اقبال کی نظر آغاز ہی سے محققانہ تھی۔ اس لیے اسکی زندگی میں مغرب کی کورانہ تقلید کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اقبال نے یورپ کے سطحی جلووں کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ

وہ اس کے باطن پر بھی گہری نظر ڈالتا گیا۔اس نے فرنگ میں علم وہنر کے کمالات اور انسانی زندگی کی بہبود کے لئے ان کے کمالات کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس سے بھی آگاہ ہو گیا کہ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت بھی مضمر ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا (۱۵)

اس دور کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا رخ تبدیل ہو گیا۔اسی زمانے کی چند نظمیں ایسی ہیں جن میں اقبال کی آئندہ پیغمبرانہ شاعری کے خط وخال ابھرتے نظر آتے ہیں۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک جو نظمیں اور غزلیں کہی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال وطنیت کے مسئلے پر اور اسلامی نقطہ نگاہ سے غور کرنے کی طرف مائل ہو رہے تھے اور انہوں نے سنجیدگی سے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاید ہندوستان میں جو دو بڑی قومیں آباد ہیں، ان کا مذہبی اور تمدنی اختلاف آخر ایسے افتراق پر منتج ہو گا جس میں وطنیت کے اسلامی تصور کو مرکزیت حاصل ہو گی۔(۱۶)

پیر مغاں افرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم سخن بدل گئی اب نہ خدا کے واسطے ان کو مے حجاز دے (۱۷)

اسی طرح کوشش ناتمام، طلبہ علی گڑھ کے نام اور عبدالقادر کے نام اس لحاظ سے عمدہ مثالیں ہیں۔

یہ امتیاز بھی اسی دور کو حاصل ہے کہ اقبال کا تصورِ وطنیت، ملت کے تصور میں بدلتا نظر آتا ہے:

وجود افراد کا ہے مجازی ہستی قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا (۱۸)

اس دور کی آخری نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) میں تہذیب حجازی کی شان و شوکت اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔اسلامی تہذیب و تمدن کی تباہی اور شکست انہیں بہت متاثر کرتی ہے۔ اس نظم کو فکر اقبال کے حوالے سے انقلابی شاعری کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

قیام یورپ کا سب سے بڑا کارنامہ اقبال کی کتاب ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا ہے انگریزی میں اس کا نام (Development of Metaphysics in Persia) ہے۔"فلسفۂ عجم" کے نام

سے میر حسن الدین نے ۱۹۲۷ء میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں اقبال نے ایرانی تفکر کے منطقی استدلال کا سراغ لگانے کی کو۔شش کی ہے اور اس کو فلسفہ جدید کی زبان میں پیش کیا ہے۔ دوسرا اس میں اقبال نے تصوف کے موضوع پر سائنسی طریقے سے بحث کی ہے۔

تیسرا دور (1908ء تا دمِ مرگ):

یورپ کی مادہ پرست تہذیب اور لادین سیاست کے محرکات و نتائج کے گہرے مطالعہ نے اقبال کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ ظاہر ہے اس ذہنی انقلاب کے بعد اقبال کے جذبات و خیالات کا رخ وطنیت سے ملت یا قومیت کی طرف مڑ گیا۔(۱۹)

اقبال نے اس دور میں مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات اور ان کی صداقت وعظت سے آگاہ کر کے ان کے احساس کمتری کو مٹانے اور ان کے احساس برتری کو ابھارنے کی کوشش کی۔ وہ فکری انقلاب جو قیامِ یورپ کے بعد رونما ہوا، اس کا اظہار اس عرصے کی شاعری میں ملتا ہے۔ اقبال کی شاعری کے بڑے موضوعات مثلاً تصوف، عشق، خودی، بے خودی، تہذیب مغرب، مرد مومن اور عشقِ رسول ﷺ وغیرہ اسی دور سے متعلق ہیں۔

تصور عشق:

اقبال نے عشق کے تصور کا پیراہنِ حریر اتنے رنگا رنگ تاروں سے تیار کیا ہے کہ اس کلمے کی کوئی اصطلاحی یا جامع ومانع تعریف کرنا ناممکن ہے۔ سچ یہ ہے کہ جس طرح مولانا روم نے شمس کی ذات کو عشق کی تمام کیفیات کے اظہار کے لیے انتخاب کر لیا تھا۔ اسی طرح اقبال نے خود عشق کے تعقل کو محبوبیت کا رتبہ بخشا ہے۔(۲۰)

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں اقبال کے انسانی عشق کا تصور خالص مجازی تھا۔ اس میں کسی اور جذبے کی آمیزش نہیں تھی۔ یورپ سے واپسی پر اس کا مجازی عشق اجتماعی اور اخلاقی مقاصد کا عشق بن گیا۔ دونوں حالتوں میں اس میں جذبے سے زیادہ فکر و تعقل نمایاں ہے۔(۲۱)

اقبال کا تصورِ عشق اپنے پہلو میں فلسفہ خودی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے ہاں عشق، جذبہ ارتقا، ذوقِ تخلیق، ذوقِ تسخیر اور استحکام خودی ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔(۲۲)

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق ۔۔۔ عقلِ انسانی ہے فانی، زندہ جاوید عشق (۲۳)
ہے مگر نقش میں رنگِ ثباتِ دوام ۔۔۔ جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ ۔۔۔ عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا ۔۔۔ اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشقِ دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔۔۔ عشق خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک ۔۔۔ عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام (۲۴)

مردِ مومن:

انسان کامل یا مردِ مومن اقبال کا من پسند موضوع ہے۔ فکری ارتقاء کی اس منزل میں یہ اپنے نقطہ عروج پر نظر آتا ہے۔ اقبال جب مردِ مومن کہتے ہیں تو ایمان کا سب سے بلند درجہ ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے یعنی مقام دعوت وعزیمت اور یہ مقام ان ہی کو حاصل ہوتا ہے جنہیں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے بے پناہ عقیدت ہوتی ہے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے ۔۔۔ یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا ۔۔۔ خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے (۲۵)

تصورِ ملت:

اس دور میں وطنیت کا تصور مکمل طور پر قومیت کا لبادہ اوڑھ چکا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر ۔۔۔ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۲۶)
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی ۔۔۔ اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر (۲۷)

تہذیبِ مغرب:

مغرب کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز روسو اور لوتھر کی ذات سے ہوا اُس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہلِ مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمع نظر سے ہٹ کر، جو تمام نوعِ انسان سے متعلق تھا، اقوام و ملل کے تنگ حدود میں الجھ گئیں۔(۲۸)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (۲۹)

اقبال نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء کا عرصہ یورپ میں گزارا اور مغرب کی تہذیب کو بڑے قریب سے دیکھا۔ مغربی اقوام کی مادہ پرستی دیکھ کر اقبال ان کے مستقبل سے مایوس ہو گئے اور اقبال کو یقین ہو گیا کہ تہذیبِ حجازی کی طرف عود کرنے سے ہی عالم کی کامیابی ہے۔ اقبال نے مغرب کی سیاست کی چالوں کو آشکار کیا اور سیاستِ حجازی کی اہمیت کو اور خلافت کو اجاگر کیا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (۳۰)

اسرارِ خودی 1915ء:

مثنوی اسرارِ خودی پہلی مرتبہ اپریل ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ علامہ نے اس کی اشاعت سے قبل اپنے چند دوستوں کو خطوط بھی لکھے تھے کہ اس مثنوی کے لیے کوئی موزوں نام تجویز کریں۔ چناچہ اس سلسلے میں انھوں نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو بھی خطوط لکھے تھے کہ یہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت واستحکام پر بحث کی گئی ہے، تقریباً تیار ہے اور پریس جانے کو ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام "اسرارِ حیات" اور "پیامِ سروش" تجویز کیے ہیں۔

بہر حال مختلف ناموں میں سے "اسرارِ خودی" علامہ کو پسند آیا اور اس میں یہ خوبی بھی ہے کہ یہ ترکیب مثنوی کے پہلے شعر میں مستعمل ہے:

پیکرِ ہستی ز اسرارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو بعض صوفی اور پیر جو روایاتِ باطلہ کی پابندی میں گرفتار تھے اور شریعتِ حقہ سے ناواقف تھے، اقبال کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ورغلایا کہ اقبال کو دار پر کھینچ دو کیونکہ یہ لوگوں کو مغربی مادیت کی تعلیم دے رہا ہے۔ جب کہ اقبال ان لوگوں میں سے ہے جو ایک پیغام اور ایک مقصد لے کر کبھی کبھی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مشرق کی روح ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اس نے اپنے عصا سے چٹان پر ضرب لگائی ہے جس سے وہ چشمہ پھوٹا ہے جو بنی اسرائیل کے چشموں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ (۳۱)

اقبال کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو خودی یا شخصیت انسان کی عظیم ترین متاع ہے۔انسان میں زندہ رہنے کا احساس تبھی قائم رہتا ہے کہ اس کے جذبات میں تناؤ کی حالت مسلسل برقرار رکھی جائے تاکہ شدتِ جذبات کو نہ تو ضعف پہنچے اور نہ اس میں کمی واقع ہونے دی جائے۔پس اقبال کے ہاں جذبات کے تناؤ یا مسلسل چاہتے رہنے کا نام ہی زندگی ہے۔(۳۲)

پیکر ہستی زاسرار خودی است	ہر چہ می بینی زاسرار خودی است
خویشتن راچون خودی بیدار	آشکارا عالم پندار کرد
نقطہ نوری کہ نامِ اوخودی است	زیرِ خاکِ ماشرارِ زندگی است
ازمحبت می شود پایندہ تر	زندہ تر سوزندہ ترتابندہ تر (۳۳)

رموزِ بےخودی1918ء:

تصورِ بے خودی دراصل اسرارخودی کادوسرا حصہ ہے۔اس میں بتاتے ہیں کہ افراد کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک خاص حدتک انا کی انفرادی حیثیت کو برقراررکھیں اوراس کے بعد ملت کی فلاح وبہبود پر انفرایت کو قربان کردیں۔

مثنوی رموزِ بے خودی ۱۹۱۸ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی تھی۔اس میں علامہ نے فرداور ملت کے باہمی ربط کی جس منطقی انداز میں صراحت کی،اس سے فلسفہ خودی اور "بے خودی" کے درمیان مکمل ہم آہنگی آشکار ہوگئی۔جس طرح علامہ نے خودی کے لفظ کو ایک نیا رنگ وآہنگ دیا بعینہ "بے خودی" کو بھی بالکل نئے معنی پہنائے ہیں۔اگر خودی سے اقبال کی مراد اثبات وتعیین ذات ہے تو بے خودی سے مراد فرد کا جماعت میں انضمام ہے۔(۳۴)

اس مثنوی کے مباحث عالیہ پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوسکتی ہے کہ علامہ نے اس میں اسلام کے دستورالعمل کی وضاحت کردی ہے۔یعنی اس کے مطالعہ سے ہر شخص اسلام کے بنیادی افکار، اصول اور ارکان سے آگاہ ہوسکتا ہے اور جو نقش اس کے مطالعہ سے دماغ میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دینِ اسلام بلاشبہ ایک مخصوص ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے،اس لیے وہ دنیا کے کسی نظام حیات یا دستورالعمل سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کرسکتا۔اسلامی دستورالعمل ایک عضو کل کا حکم رکھتا ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ کوئی

شخص اس کے قانون کی خلاف ورزی کر کے ملتِ اسلامیہ میں شامل رہ سکے۔ اس دستور العمل کے اصول اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر ایک اصل کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جس طرح مشین کا ایک پرزہ اگر اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو مشین بیکار ہو جائے گی۔

فرد را ربط جماعت رحمت است　　جوہر اورا کمال از ملت است

تاتوانی با جماعت یار باش　　رونق ہنگامہ احرار باش

حرزِ جان کن گفتہ خیر البشر ﷺ (۳۶)

ہست شیطان از جماعت دور تر　　فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند

سلک و گوہر، کہکشان و اختر اند　　فرد میگیرد ز ملت احترام

ملت از افراد می یابد نظام　　فرد تا اندر جماعت گم شود

قطرہِ وسعت طلب قلزم شود (۳۶)

پیامِ مشرق 1933ء:

اس کی تصنیف کی وجہ اقبال خود بتاتے ہیں کہ جرمن شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھی گئی۔ اس میں اقبال بتاتے ہیں کہ مغرب کی مادیت جوش اور زندگی سے معرا ہے۔ پیامِ مشرق میں اقبال نے احساس، جوش، حرکت و عمل کو پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔

پیامِ مشرق کی اہمیت:

"پیامِ مشرق" علامہ اقبال کے فارسی کلام کا تیسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۳ء مین چھپا۔ اس سے پہلے ان کے فارسی کلام کے دو مجموعے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے عنوانات میں چھپ چکے تھے۔

"پیامِ مشرق" کو اس اعتبار سے خصوصیت حاصل ہے کہ اقبال نے یہ جرمنی کے معروف اور بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھی اور گوئٹے کو اپنی طرح "دانائے ضمیرِ کائنات" گردانا ہے۔ گوئٹے کی بے چین روح مغرب کی ہنگامہ پرور زندگی سے بے زار تھی۔ وہ مشرق کی پُر سکون فضا کا متمنی تھا۔ فارسی شاعر حافظ شیرازی کے کلام کے سحر میں گرفتار تھا۔ دونوں کے جذبات میں ایک طرح کی ہم آہنگی

پائی جاتی ہے۔اقبال نے گوئٹے کی اس ذہنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے،اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں"۔ لٰہذا کہ سکتے ہیں کہ حافظ کا کلام جس طرح "مغربی دیوان" کا محرک بنا ویسے ہی گوئٹے کا "مغربی دیوان" اقبال کے "پیامِ مشرق" کی تخلیق کا باعث بنا۔اقبال کا مجموعہ کلام "پیامِ مشرق" گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے قریباً ایک سو سال بعد وجود میں آیا۔علامہ اقبال سو سال کے پہلے جرمنی اور اپنے زمانے کے مشرق کے حالات میں ایک طرح کی مماثلت پاتے ہیں۔اس دیوان سے اِس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بے زار ہو کر مشرق کی سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔(۳۷)

علامہ نے پیامِ مشرق میں ایسے مذہبی، اخلاقی اور ملی حقائق پیش کیے ہیں جن کا مقصد افراد اور ملل کی باطنی تربیت ہے۔ وہ اقوامِ مغرب کو خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک معنوی اور فکری طور پر زندگی میں انقلاب برپا نہ ہو، خارجی انقلاب کی کوئی حیثیت نہیں۔اس انقلاب کو شرمندہ حقیقت بنانے کی ذمہ داری خود اقوام اور افراد کے کندھوں پر ہے۔(۳۸)

"پیامِ مشرق" کو علامہ اقبال نے اپنے ہم عصر افغانستان کے فرمانروا امیر امان اللہ خان کے نام معنون کیا ہے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ امان اللہ خان کی شخصیت میں وہ روح ایمانی دیکھ رہے تھے جو مسلمانوں کے لیے آزادی اور سربلندی کی موجب بن سکے۔اقبال اسے شاہانہ لباس میں درویشانہ زندگی بسر کرنے اور خود شناسی کی تلقین کرتے ہیں۔جن مسلمانوں نے عظمت اور سربلندی حاصل کی انھوں نے امیری میں فقیری کی تھی اور یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ ملت کی زندگی نبی کریم ﷺ کے عشق کے دم سے ہے لٰہذا نبی ﷺ سے والہانہ محبت کی تلقین کرتے ہیں۔ بہر حال امیر امان اللہ خان ان کی توقعات پر پورا نہ اتر سکے۔

زبورِ عجم:

اس کتاب میں اول زبورِ عجم ہے جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔اس میں مختلف غزلیات اور قطعات ہیں۔اس کے بعد دو مثنویاں ہیں۔ مثنوی بندگی نامہ کے اندر غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک جہاد ہے۔زبورِ عجم میں ایک حصے میں خدا سے خطاب ہے جبکہ دوسرے حصے میں تمام عالم اور بالخصوص مشرق کو خطاب کیا ہے۔

"زبورِ عجم" کی غزلیات میں سوز و ساز اور لذتِ غم کی کیفیت نے اس شاہکار کو خود اس کے خالق کی نظر میں کتنا عظیم بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ خود شاعر کے ایک اردو شعر سے ہوتا ہے:

اگر ہو ذوق تو فرصت میں پڑھ زبورِ عجم　　　فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

حقیقت یہ ہے کہ "زبورِ عجم" فغان نیم شبی کی ایک مسلسل داستان ہے جس نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی گونا گوں کیفیتوں اور تقاضوں کو غزل کے رنگ میں اور جذبات کی زبان میں سمویا ہے۔ اس کتاب میں سوز و ساز کی ایک منفرد اور بے مثال کیفیت ہے۔ موسیقی کی جو فراوانی اور متنوع دلکشی اس مجموعے میں ہے، شاید کسی دوسری کتاب میں نہیں۔ اس کے جذب و مستی اور وفورِ شوق کی متلاطم کیفیت اس کے وجد آفرین نغموں میں چھلک رہی ہے۔ اس میں شاعر کی نالہ نیم شبی کا نیاز بھی ہے اور دل کی پوشیدہ بے تابیاں بھی ہیں۔ اس کی امنگیں اور آرزوئیں بھی ہیں اور جستجویں بھی۔ اس کے جذبات وافکار نغمہ و آہنگ کے طوفان میں ڈھل کے نکلے ہیں۔ یہاں عشق گرہ کشا کے فیض کا ترانہ بھی ہے اور عقل فسوں پیشہ کا فسانہ بھی۔ مگر تفکر و تامل کا اظہار جذبات کی زبان میں اس طرح ہوا ہے کہ سنگین حقائق پر تغزل کا گمان گزرتا ہے۔ (۳۹)

برخیز کہ آدم راہنگام نمود آمد　　　این مشت غباری راانجم بہ سجود آمد
آن راز کہ پوشیدہ در سینہ ہستی بود　　　از شوخی آب و گل در گفت و شنود آمد (۴۰)

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (1939ء):

یہ اقبال کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف موقعوں پر دیے تھے۔ اس کو اسلامی علمِ کلام کی تصنیف کہنا بے جا نہ ہوگا۔ خطبات کے موضوعات کچھ اس طرح ہیں:

۱.　علم اور روحانی حال و وجدان
۲.　مذہبی وجدان کی فلسفیانہ جانچ
۳.　تصورِ باری تعالیٰ اور دعا کا مفہوم
۴.　نفس انسانی، مسئلہ اختیار و بقا
۵.　اسلامی ثقافت کی روح
۶.　اسلام کی تعمیر میں اصول حرکت

۷۔ روحانی وجدان کی حقیقت کا امکان

جاوید نامہ 1932ء:

علامہ کی اس مشہور مثنوی کا خاکہ ۱۹۲۷ء سے ان کے ذہن میں تھا۔ (ایک موقع پر دورانِ گفتگو انھوں نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا) تاہم پہلی مرتبہ وہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

اس مثنوی میں انہوں نے سیرِ افلاک کے ذریعے اپنا فلسفہ حیات، اپنے دور کے بعض اہم سیاسی اور اجتماعی مسائل اور تحریکات نیز اسلامی ملتوں کے حقائق و مسائل پر اپنا نقطہ نظر ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ تمثیلی و تخیلی انداز اختیار کرنے کے لیے انہیں بعض کتب کی تلاش تھی جن میں سیرِ افلاک کے ذریعے زندگی کے کسی خاص نقطہ نظر یا روحانی و اخلاقی اقدار کا اظہار و ابلاغ پیش نظر رہا ہو۔ اس سلسلے میں ان کے خطوط کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی میں قسم قسم کی علمی و فکری، دینی و سیاسی اور اجتماعی حقائق کے پیشِ نظر علامہ کو بجا طور پر اپنی اس مثنوی کی بے مثل حقیقت کا احساس تھا۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک میرا علم ہے، کسی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی"۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس میں حقیقت و تخیل کو جس انداز میں ہم آہنگ کیا گیا ہے اور اس میں افکار کے عمق، تخیل کی توانائی و فسوں کاری اور قوتِ بیانیہ کے سحر و اعجاز کے ساتھ ساتھ جراتِ اظہار کا جو انداز ملتا ہے، اس نے علامہ کے اس شاہکار کو یکتائے روزگار ادبی اور فکری تخلیق بنا دیا ہے۔ علامہ کی آرزو تھی کہ اس کتاب کا بہ طریق احسن ترجمہ کیا جائے اور اگر ہو سکے تو اس کے مطالب کو متصور بھی کیا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ کوشش مترجم اور مصور کی شہرت کا باعث ہو گی۔"(41)

یہ کتاب اقبال کی بلندی فکر و فن کی معراج ہے۔ اس میں اقبال زندہ رود کے نام سے پیر رومی کی قیادت میں افلاک کی سیر کرتے ہیں آخر میں خطاب بہ جاوید کے عنوان سے جاوید کو اور در حقیقت تمام نوجوان نسل کو خطاب کیا ہے:

نوجوانان تشنہ لب، خالی ایاغ　　　شستہ رو، تاریک جان، روشن دماغ
کم نگاہ و بی یقین و ناامید　　　چشمِ شان اندر جہان چیزی ندید! (۴۲)

خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ جاوید نامہ ایک بحرِ بے کراں ہے۔ اس کی نسبت یہ توقع رکھنا کہ کوئی شخص چند لمحوں میں اس کا خلاصہ یا لبِ لباب بیان کر دے گا، کسی بھی مفکر یا مقرر کے بس کی بات نہیں۔ اس کتاب

میں تخییل و تمثیل سے کام لے کر ایک سحر نگار مفکر اور فکر انگیز شاعر حکیم نے انسان کی دیرینہ روحانی کشاکش کو نہایت دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔(۴۳)

بالِ جبریل 1935ء:

علامہ کی یہ کتاب تعلیمات سے بھرپور ہے۔ راہنماؤں کی کج روی، خلوص و یقین کے فقدان اور طلسم مغرب کے فریب میں گرفتاری پر اقبال نے سخت سرزنش کی ہے اور عرفان خودی کا اور مومن بننے کا پیغام دیا ہے۔ عشق کی تعریف بڑے ہی دلنشین انداز میں بیان کی ہے:

عشق دمِ جبریل، عشق دل مصطفیٰ ﷺ عشق خدا کا رسول ﷺ عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات (۴۴)

بالِ جبریل میں اقبال کے مردِ کامل کا تصور اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے فرماتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کار کشا و کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندہ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دل فریب، اس کی نگاہ دل نواز (۴۵)

پس چہ باید کرد ای اقوام مشرق 1936ء:

اس میں اول مثنوی ہے۔ اقبال پیر رومی کی زبان سے خوشخبری سناتے ہیں کہ خاور از خواب گران بیدار شد۔ پھر رومی اقبال کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم معنی دین و سیاست پھر اہلِ مشرق کو سنا دو۔ اس کتاب میں مثنوی مسافر بھی شامل ہے جو ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی۔

ضرب کلیم 1936ء:

ضرب کلیم کے ۶ عنوانات ہیں:

۱۔ اسلام اور مسلمان

۲۔ تعلیم و تربیت

۳۔ عورت

۴۔ادبیات، فنون لطیفہ

۵۔سیاستِ مشرق ومغرب

۶۔ محراب گل افغان کے افکار

ارمغانِ حجاز 1938ء:

علامہ اقبال کے مرض الموت میں زیر ترتیب تھی۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں اشاعت کی نوبت آئی۔ایک حصہ فارسی اور دوسرا اردو شاعری پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے آخر میں بھی اقبال نے اپنا خودی کا پیغام جو کہ پختگی کی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے، بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات　　　کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ حیات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکران ترا　　　ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل وفرات

خودی ہے زندہ تو ماند کاہ پیشِ نسیم　　　خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات(۴۶)

اقبال کی فنکاری شروع سے ہی لطیف و نفیس رہی ہے۔ایک طرف لطافت و نفاست اور دوسری طرف دقت و باریکی کا امتزاج بانگ درا کے مختلف حصوں سے شروع ہو کر بالِ جبریل میں اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ جس کے بعد لطافت و نفاست بڑھتے جاتے ہیں اور ضربِ کلیم میں اپنے شباب پر نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مجموعہ کلام ارمغانِ حجاز میں اس شباب کے چند اشعار اس طرح نگاہوں کے سامنے آتے ہیں کہ تمثیل کا وہ عنصر جو ابتداء سے اقبال کی شاعری میں کار فرما تھا، بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔(۴۷)

سرودفتہ باز آید کہ نہ آید؟　　　نسیمی از حجاز آید کہ نہ آید؟

سر آمد روزگار این فقیری؟　　　دگر دانای راز آید کہ نہ آید؟

حوالہ جات

۱. افتخار احمد، صدیقی، ڈاکٹر، عروج اقبال (لاہور: بزمِ اقبال، کلب روڈ ۱۹۸۷ء) ص ۴۔

۲. عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکرِ اقبال (لاہور: بزمِ اقبال، کلب روڈ ۱۹۸۳ء) ص ۱۔

۳. ایضاً، ص ۲۳۔

۴. ایضاً ، ص ۹۔

۵. افتخار احمد، صدیقی، ڈاکٹر، عروج اقبال ص ۴۵-۴۶۔
۶. ایضاً، ص ۴۹۔
۷. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز) ص ۲۷۔
۸. عبدالحکیم، خلیفہ، فکرِ اقبال، ص ۲۶۔
۹. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۹۹۔
۱۰. ایضاً، ص ۱۰۰۔
۱۱. ایضاً، ص ۷۱۔
۱۲. ایضاً، ص ۸۸۔
۱۳. ایضاً، ص ۴۶۔
۱۴. غلام حسین، ذوالفقار، ڈاکٹر، اقبال کا ذہنی اور فکری ارتقا (لاہور: بزمِ اقبال اکتوبر ۱۹۹۸ء) ص ۱۵۔
۱۵. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۱۴۱۔
۱۶. عابد علی، عابد، سید، شعرِ اقبال (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۳ء) ص ۱۱۱۔
۱۷. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۱۱۳۔
۱۸. ایضاً، ص ۱۳۰۔
۱۹. افتخار احمد، صدیقی، عروج اقبال، ص ۳۴۵، ۳۴۶۔
۲۰. عابد علی، عابد، سید، شعرِ اقبال، ص ۲۳۶۔
۲۱. اورینٹل کالج میگزین، جشنِ اقبال نمبر (لاہور: پنجاب یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۷ء) ص ۲۲۷۔
۲۲. شاہد حسین، رزاقی (مرتبہ) مقالاتِ حکیم از خلیفہ عبدالحکیم، جلد دوم (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامی، کلب روڈ، ۱۹۶۹ء) ص ۱۱۸۔
۲۳. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۱۵۶۔
۲۴. ایضاً، ص ۳۸۶۔
۲۵. ایضاً، ص ۲۶۹۔
۲۶. ایضاً، ص ۲۴۸۔
۲۷. ایضاً، ص ۲۶۵۔
۲۸. اقبال، خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ، ۱۹۳۰ء، مترجمہ نذیر احمد نیازی صاحب۔
۲۹. اقبال، کلیاتِ اقبال، ص ۲۶۱۔

۳۰. ایضاً ، ص ۲۷۴۔

۳۱. یوسف سلیم، چشتی، شرحِ اسرارِ خودی (لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن) ص ۱۴، ۵۴۔

۳۲. جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۵ء) ص ۱۴۔

۳۳. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء) ص ۱۲۔

۳۴. عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۰ء) ص ۵۳۔

۳۵. یوسف سلیم چشتی، شرحِ رموزِ بے خودی، ص ۲۴۔ ۲۔

۳۶. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص ۸۵۔

۳۷. اقبال، دیباچہ پیامِ مشرق (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء) ص ۱۷۷۔

۳۸. عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۵۷۔

۳۹. ایضاً ، ص ۱۱۲، ۱۱۱۔

۴۰. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص ۴۵۵۔

۴۱. عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۲۴۔

۴۲. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص ۷۹۱، ۷۹۰۔

۴۳. شاہد حسین رزاقی (مرتبہ) مقالاتِ حکیم از خلیفہ عبدالحکیم، ص ۲۷۵۔

۴۴. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۳۸۷، ۳۸۶۔

۴۵. ایضاً ، ص ۳۸۹۔

۴۶. ایضاً ، ص ۶۶۷۔

۴۷. عبدالغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن (لاہور: اقبال اکیڈمی ۱۹۹۰ء) ص ۴۵۷۔